لغات واعراب قرآن (۴۸)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۳۲)

آیات ۴۹-۵۰

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ا کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

© rasailojaraid

۲ : ۳۲

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ
نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ○ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ
وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

© rasailojaraid

۲:۳۲:۱ اللغـــة

[وَاِذْ] "وَ" کے معنی اور استعمال کے لیے الفاتحہ : ۵ [۱:۴:۱(۳)] اور "اِذْ" کے معانی و استعمال کے لیے البقرہ : ۳۰ [۲:۲۲:۱(۱)] میں دیکھئے۔ "وَاِذْ" کا (یہاں) لفظی ترجمہ ہے "اور جب" ۔ "اذ" کے قواعد استعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے (جن کی وضاحت ۲:۲۲:۱(۱) میں ہو چکی ہے) یہاں اس کا ترجمہ "(یاد کرو) جب کہ" (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ" (اس وقت کو یاد کرو) جب"، "اور (یاد کرو) جب"، "(ہمارے ان احسانات کو یاد کرو) جب"، (وہ وقت یاد کرو) جب/جب کہ" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ان سب تراجم میں یہ (یاد کرو) والی بات "اذ" ظرفیہ کے نحوی تقاضوں کی بناء پر لائی گئی ہے۔ تاہم اُردو محاورے میں اس کے لانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگوں نے اس کے صرف لفظی ترجمہ "اور جب" پر ہی اکتفاء کیا ہے۔

۲:۳۲:۱(۱) [نَجَّیْنٰکُمْ] (یہ رسم املائی ہے رسم عثمانی پر آگے بات ہوگی) اس میں آخری ضمیر منصوب "کُمْ" بمعنی "تم کو" ہے اور "نَجَّیْنَا" کا مادہ "ن ج و" اور وزن "فَعَّلْنَا" ہے اس مادہ سے فعل مجرد "نجا ینجو" (باب نصر سے) اور مختلف مصادر کے ساتھ مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) "نجا ینجو نجاۃً" کے معنی ہیں: "نجات پانا" (یہ عربی کا لفظ "نجَاۃ" یا "نجوٰۃ" (مثل زکوٰۃ وصلوٰۃ) ہی ہے جو اُردو میں لمبی "ت" کے ساتھ لکھا جاتا ہے) "چھوٹ جانا، خلاصی پانا، محفوظ ہو جانا، بچ جانا"۔ یہ فعل لازم ہے اور جس سے نجات پائی جائے اس کا ذکر کرنا ہو تو اس سے پہلے "مِن" لگتا ہے مثلاً "نجا مِنْہ" (اس نے اس سے نجات پائی) کہتے ہیں "نجاہ" کہنا غلط ہے۔ (۲) نجا ینجو نجویً کے معنی ہیں: "سرگوشی کرنا، کسی سے خفیہ بات کرنا" ان معنی کے لیے یہ فعل بطور متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفعول عموماً بنفسہٖ آتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "نجا فلانًا" (اس نے فلاں سے سرگوشی کی)۔ عربی زبان میں فعل بعض دیگر معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً "نجا ینجو نجاءً" = جلدی کرنا" "نجا ینجو نجوًا۔ کھال اتارنا یا درخت کاٹنا" وغیرہ — تاہم ان معنی میں اس مادہ سے کوئی فعل قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے صرف دو صیغے (یوسف : ۴۵ اور القصص : ۲۵) آئے ہیں اور وہ بھی صرف پہلے معنی (نجات پانا) کے لیے۔ دوسرے معنی (سرگوشی کرنا) کے لیے قرآن میں صیغۂ فعل تو نہیں آیا مگر اس کا مصدر (نجوی) مختلف شکلوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ) میں گیارہ مقامات پر وارد ہوا ہے فعل مجرد کے علاوہ اس مادہ (نجو) سے مزید فیہ کے باب تفعیل سے مختلف افعال کے صیغے

© rasailojaraid

۳۷ جگہ' بابِ افعال سے ۲۳ جگہ' باب تفاعل سے ۴ جگہ اور باب مفاعلہ سے صرف ایک جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ فعل مجرد و مزید فیہ سے مصادر اور اسماء مشتقہ بھی ۱۷ جگہ وارد ہوتے ہیں۔ ان سب پر حسبِ موقع بات ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ کلمہ "نَجَّیْنَا" اس مادہ (نجو) سے باب تفعیل کا فعل ماضی صیغہ جمع متکلم ہے۔ بظاہر اسے "نَجَّوْنَا" ہونا چاہیے تھا (دیکھیے اوپر شروع میں اس کا مادہ اور وزن)۔ مگر اہلِ عرب فعل ناقص کے مزید فیہ ابواب میں "و" کو بھی "ی" میں بدل کر بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس باب (تفعیل) سے فعل "نَجَّی . . . یُنَجِّی، تَنْجِیَۃً" (دراصل نَجَّوَ یُنَجِّوُ تَنْجِوَۃً) زیادہ تر بطور فعل متعدی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بنیادی معنی ہیں: . . . . . کو چھڑانا، . . . . کو خلاصی دلانا، . . . . کو نجات دینا، . . . . . کو رہائی دینا" — اس کا مفعول تو بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) آتا ہے اور جس سے نجات دلائی جائے اس پر "مِنْ" لگتا ہے۔ عربی ڈکشنریوں میں آپ کو اس فعل کے کچھ اور معنی (مثلاً اونچی زمین پر چھوڑنا، زمین [illegible] بھی ملیں گے تاہم قرآن کریم میں ہر جگہ یہ فعل "نجات دینا" "چھڑانا" والے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

۲ : ۳۲ : ۱ (۲) [مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ] یہ تین کلمات ہیں "من. آل اور فرعون" — ان میں سے "مِن" (جس کا ترجمہ یہاں "سے" ہو گا) کے معانی اور استعمالات کئی دفعہ سامنے آ چکے ہیں۔ ضرورت ہو تو ۲ : ۲ : ۱ (۵) میں دیکھ لیجئے۔ "آل" (یہ اس کا عام املائی ضبط ہے قرآنی ضبط پر آگے بات ہو گی) کا مادہ ایک تو ① "اول" بتایا گیا ہے۔ معاجم (ڈکشنریوں) میں عموماً یہ لفظ اسی مادہ کے تحت بیان ہوتا ہے۔ گویا اس کا وزن "فَعَلٌ" اور شکل اصلی "اَوَلٌ" ہے جس میں واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل جاتی ہے اور لفظ "آل" بن جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "آل یَئُوْلُ مَآلًا (دراصل اَوَلَ یَاْوُلُ مَاْوَلًا) باب نصر سے آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "لوٹ آنا، انجام کار کی طرف آنا" اس کے ساتھ عموماً "اِلٰی" کا صلہ لگتا ہے کہتے ہیں "آل الیہ" (اس کی طرف لوٹا)، اسی کا مصدر "مَآل" بمعنی "انجام اور نتیجہ" اردو میں مستعمل ہے۔ اور "آل یئول اِیالًا" (جو دراصل "اِوَالًا" ہے) کے معنی ہیں: "حاکم ہونا، حکومت کرنا" اس صورت میں بعض دفعہ اس کے ساتھ "علی" کا صلہ آتا ہے مثلاً کہتے ہیں: "آلَ علی القوم و آلَ الرعیۃَ (قوم یا رعیت کا انتظام سنبھالا) — تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے فعل کا کوئی صیغہ کسی معنی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اس سے باب تفعیل کا مصدر "تاْویل" قرآن کریم میں ۱۷ جگہ آیا ہے۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c
© rasailojaraid

(۲) بعض کے نزدیک اس (آل) کا مادہ "اھل" ہے[1] اس کی اصلی شکل "اَھْلٌ" (بروزن فَعْلٌ) ہے پھر خلافِ قیاس "ہ" کو ہمزہ (أ) میں بدل دیا جاتا ہے اور ہمزۂ مفتوحہ اور ہمزۂ ساکنہ مل کر "آ" بن جاتے ہیں یعنی اَھْلٌ = أَأْلٌ = آلٌ۔

اس مادہ (اھل) سے فعل مجرد "اَھَلَ یَأْھِلُ اُھُوْلًا" (باب ضرب اور نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "شادی کر لینا، گھر بار بنا لینا، گرہستی ہو جانا"۔ اور اسی سے فعل مجہول "اُھِلَ المکانُ" کے معنی "مکان یا جگہ آباد ہو جانا" ہیں اور مکانات اور آبادی والی جگہ کو "مکانٌ مَأھُول" کہتے ہیں۔ اس فعل سے بھی کوئی صیغۂ فعل قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ البتہ لفظ "اھل" مختلف صورتوں (مفرد مرکب واحد جمع) میں ۱۲۷ جگہ وارد ہوا ہے۔

● لفظ اھل کے معانی میں (۱) بیوی، بال بچے (۲) قریبی رشتہ دار (۳) کسی چیز کے ساتھ والے (۴) کسی جگہ کے رہنے والے (۵) مستحق اور صاحبِ اہلیت"۔ شامل ہیں اور یہ لفظ اضافت کے ساتھ متعدد معانی دیتا ہے اس لفظ کے معانی کی مزید وضاحت حسبِ موقع کی جائے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیرِ مطالعہ کلمہ "آل" (چاہے "اھل" سے ہے یا "اول" سے) کے متعدد معنی ہیں: مثلاً "پہاڑ کے اطراف و جوانب، سراب (خصوصاً صبح کے وقت والا)، خیمہ کا ستون وغیرہ۔ تاہم زیادہ تر یہ لفظ "اھل" ہی کے ہم معنی یا قریب المعنی استعمال ہوتا ہے اور قرآن کریم میں یہ لفظ (۲۶ جگہ آیا ہے اور عموماً ہر جگہ) اسی (اھل والے) معنی میں استعمال ہوا ہے۔

● البتہ "آل" اور "اھل" کے معنی اور استعمال میں کچھ فرق ہے مثلاً (۱) "آل" اور "اھل" دونوں کے معنی میں "گھر والے اور اولاد" شامل ہیں تاہم آل بمعنی "اولاد" (یا گھر والے) صرف بڑے آدمیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے معمولی حیثیت کے آدمیوں کی اولاد کے لیے "آل" کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا مثلاً "آل السلطان" یا "آل الملک" کہہ سکتے ہیں مگر "آلُ الخیاط" (درزی کی آل) یا "آلُ الإسکاف" (موچی کی آل) کہنا درست نہیں۔ جب کہ "اھل" (بمعنی گھر والے) کا لفظ دونوں طرح کے لوگوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے یعنی "اھلُ السلطان" اور "اھلُ الإسکاف" دونوں استعمال درست ہیں (۲) "آل" کے لفظ میں کسی بڑے آدمی کی اولاد کے علاوہ اس کے پیروکار اور متبعین بھی شامل ہوتے

---

[1] دیکھیے البیان لابن الانباری ج ۱ ص ۸۱، القاموس تحت مادہ "اھل" و "اول" مفردات راغب تحت کلمہ آل و نیز اعراب القرآن للنحاس ج ۱ ص ۲۲۳۔

© rasailojaraid.com

ہیں جب کہ "اھل" کا استعمال عموماً "گھر والوں" یا "ساتھ رہنے والوں" پر ہوتا ہے۔ ایک نسب ایک دین یا ایک مسکن اور وطن یا کوئی کاریگری سے تعلق رکھنے والے لوگ اس نسب یا دین یا شہر یا ہنر وغیرہ کے "اَھل" کہلاتے ہیں مگر اس کی "آل" نہیں کہلاتے۔

(۳) بلحاظ استعمال لفظ "آل" ہمیشہ اَعلام الناطقین (صرف انسانوں کے لیے مستعمل اسماء معرفہ) کی طرف مضاف ہوتا ہے کسی اسم نکرہ یا کسی جگہ یا زمانہ کی طرف مضاف نہیں ہوتا جب کہ لفظ "اَھل" سب کی طرف مضاف ہو سکتا ہے مثلاً "آل الرجل" کہنا درست مگر "آل رجلٍ" کہنا غلط ہے جبکہ "اھل الرجل" اور "اھل رجلٍ" دونوں طرح درست ہے۔ اسی طرح "اھل مکۃ" یا "اھل العصر" (ایک ہی زمانہ والے) کہنا درست مگر "آل مکۃ" یا "آل العصر" کہنا غلط ہے۔

(۴) "آل" سے مراد کسی بڑے انسان سے خصوصی تعلق (محض سرسری اور زبانی نہیں) رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جو نسلی قرابت کا بھی ہو سکتا ہے اور دین و شریعت میں اتباع کا بھی ۔۔۔ راغب اصفہانی نے (المفردات میں) لفظ "آل" کے معنی کی وضاحت کے لیے امام جعفر صادقؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ ان سے کسی نے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ تمام مسلمان آلِ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں تو انہوں نے جواب دیا یہ بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سائل نے اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جھوٹ اس لحاظ سے ہے کہ (آل بمعنی بڑے آدمی کے اقارب و اولاد لیں تو) ساری اُمّت آلِ محمدؐ نہیں ہے اور سچ اس پہلو سے ہے کہ اُمّت کے جو لوگ بھی شرائطِ شریعت پر پورے اترتے ہیں وہ آلِ محمدؐ یا آل النبیؐ ہیں۔

● زیر مطالعہ مرکب (من آل فرعون) کا تیسرا وضاحت طلب لفظ "فِرْعَوْن" ہے۔ یہ ایک عجمی (غیر عربی) لفظ ہے اس لیے اس کے مادہ اور وزن کی بحث بے کار ہے اور اسی لیے یہ لفظ غیر منصرف ہے یعنی علمیت اور عجمیت کے جمع ہونے کی بنا پر۔ اگرچہ کسی بھی عربی ڈکشنری میں آپ کو اس لفظ کا بیان مادہ "ف ر ع" کے آخر پر ہی ملے گا۔ (ترتیب حروف کی بناء پر) اور جدید عربی میں تو اس سے رباعی مجرد کا فعل بھی "فَرْعَنَ یُفَرْعِنُ فَرْعَنَۃً" بمعنی "متکبر و سرکش یا فرعون مزاج ہونا" استعمال کر لیتے ہیں۔

● لفظ "فرعون" مصر کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔ جیسے ایران کے بادشاہ کو "کِسریٰ" اور رومیوں کے بادشاہ کو "قیصر" کہا جاتا تھا۔ یہ دراصل قدیم مصری (قبطی) زبان کا لفظ ہے۔ جو المعجم الوسیط کے بقول کہ اس کی اصل "پرعو" (بغیر نون) تھا اور اس کا مطلب "عظیم گھرانہ" ہے۔ ابن الانباری (البیان) میں "القاموس اور اقرب الموارد کے مطابق اس کے لفظی معنی" مگر مجھے ہیں انگریزی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

میں اس کا عبرانی تلفظ (جو دراصل قبطی ہی تھا) Pharaoh رائج ہے۔ "مد القاموس" میں لین (W. Lane) نے اس کا اصل عبرانی ہجا بھی لکھا ہے۔ بعض نے اسے آرامی الاصل لفظ کہا ہے اور اس کی اصل آرامی شکل بحروف لاتینی (Feroun) لکھی ہے[1] اور یہ اس کی عربی شکل (فِرعَون) سے زیادہ مشابہ ہے۔ عربی میں ہر متکبر اور سرکش کو بھی مجازاً فرعون کہتے ہیں۔

● زیر مطالعہ عبارت میں یہ کلمہ (فرعون) بطور لقب (شاہ مصر) استعمال ہوا ہے اس لیے اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ "آل" کے معنی بھی کسی "بڑی شخصیت کے قریبی متعلقین اور متبعین" ہوتے ہیں اسی لیے یہاں "من آلِ فرعون" کا ترجمہ "قوم فرعون سے"، "فرعون کی قوم سے"، "فرعون کے لوگوں سے"، "متعلقین فرعون سے"، "فرعون والوں سے" کیا گیا ہے۔ بعض نے "آلِ فرعون سے" ہی رہنے دیا ہے جب کہ بعض حضرات نے "فرعونیوں سے" کر لیا ہے۔

[illegible] [یَسُوْمُوْنَکُمْ] کی آخری ضمیر منصوب متصل "کُمْ" بمعنی "تم کو" ہے۔ اور "یَسُوْمُوْنَ" کا مادہ "س و م" اور وزن اصلی "یَفْعُلُوْنَ" ہے۔ اصلی شکل "یَسْوُمُوْنَ" تھی جس میں واو کا ضمہ (ـُـ) ماقبل ساکن (س) کو دے دیا جاتا ہے اور یوں یہ لفظ بصورت موجودہ (یسومون) لکھا اور بولا جاتا ہے اب اس کا (موجودہ) وزن "یَفُوعُون" رہ گیا ہے۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "سام یسوم سَوْمًا" (باب نصر سے) بطور فعل لازم و متعدی (دونوں طرح) متعدد معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ صاحب المفردات (راغب اصفہانی) کے مطابق اس کی اصل (بنیادی معنی) "جانا (ذھاب) اور تلاش کرنا (ابتغاء)" ہے اور اس کے تمام معانی میں یہ دونوں یا ان میں سے ایک مفہوم ضرور موجود ہوتا ہے۔

● بطور فعل لازم اس کے کئی معنی ہیں مثلاً "جدھر منہ آئے چلے جانا" "کسی چیز کی تلاش میں نکلنا" "مویشیوں کا کھلے جہاں جی چاہے چرتے پھرنا" (ہوا یا اونٹ کا) چلتے رہنا" وغیرہ۔

● اسی طرح بطور فعل متعدی بھی اس کے متعدد استعمال ہیں۔ عموماً تو اس کے ساتھ ایک مفعول آتا ہے (اور وہ بھی زیادہ تر بنفسہ ہو کر) مثلاً (۱) "سَامَ الشَّیئَ" کے معنی ہیں "اس (چیز) پر تکا رہا اور اسے نہ چھوڑا" — اور (۲) "سَامَ الاِبلَ" کا مطلب ہے "اس نے اونٹوں (وغیرہ) کو چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا" — اور (۳) سامَ (البائع او المشتری) السلعةَ او بالسلعةِ" کا مطلب ہے (دکاندار یا گاہک نے) سامان تجارت کی قیمت بتائی یا پوچھی (سلعة = مال یا سامان)

---

[1] غرائب اللغة العربية (رفائیل نخلہ) ص ۱۹۸

© rasailojaraid.com

● اور کبھی یہ فعل (بطور متعدی) دو مفعول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور دونوں مفعول بنفسہ (منصوب) آتے ہیں مثلاً (۱) سامَ فلانًا الامرَ" کے معنی ہیں" اس نے اسے (اس) معاملہ یا حکم کا پابند کر دیا ــــ اور (۲) "سَامَ الرجلَ ذلاً او ھوانًا او خَسفًا" کا مطلب ہے"اس نے آدمی کے لیے ذلت یا عاجزی یا خواری کا ارادہ کیا' ــــ یا"اس نے اس (آدمی) پر ذلت و عاجزی مسلط کی"۔

● قرآن کریم میں یہ فعل مجرد صرف مندرجہ بالا آخر الذکر معنی میں (اور دو مفعول کے ساتھ) استعمال ہوا ہے۔ باقی استعمالات (جن کا اوپر ذکر ہوا ہے) قرآن کریم میں نہیں آئے۔ اور مستعمل فعل مجرد کے بھی مضارع کے صرف دو ہی صیغے ("یَسُوم" اور" یسومون") کل چار جگہ آئے ہیں۔ اور مزید فیہ سے صرف بابِ افعال سے ایک صیغہ فعل صرف ایک جگہ (النحل: ۱۰) وارد ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مجرد و مزید فیہ سے بعض جامد اور مشتق اسماء (مسوّمۃ۔ مسوّمین۔ سیما وغیرہ) بھی دس جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ جملہ (یَسُومُونَکُم) کا صیغہ فعل "یسُومُون" اس فعل مجرد سے مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ شروع آیت والے "وَاِذْ" سے (یعنی ایک قصہ ماضی سے) کا متعلق ہونے کی بنا پر یہاں اس فعل مضارع کا ترجمہ فعل ماضی بلکہ ماضی استمراری کی طرح کرنا پڑے گا۔ یہاں فعل (یسومون) کے ساتھ ایک مفعول تو (کُمْ) ہے دوسرا مفعول آگے آ رہا ہے اس پر مزید بات تو حصہ" الاعراب" میں ہوگی۔ تاہم فعل "سَامَ یَسُوم" کے مندرجہ بالا معانی (یعنی کسی کے لیے ذلت و خواری کا ارادہ کرنا یا اس پر ذلت وغیرہ مسلط کرنا) اور آگے بیان ہونے والے دوسرے مفعول (سوء العذاب) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو مترجمین نے یہاں" یسُومُونکم ..." کا بامحاورہ ترجمہ : "پہنچاتے تھے تم کو"۔ ۔ "دیتے تھے تم کو"۔ ۔ "کرتے تھے تم پر"۔ ۔ "توڑ رہے تھے تمہارے اوپر"۔ ۔ سے کیا ہے۔ جب کہ بعض نے غالباً اس فعل (سام یسوم) کے اصل بنیادی مفہوم (جانا اور تلاش کرنا) کو سامنے رکھتے ہوئے اس (یسومونکم ....) کا ترجمہ" وہ فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری (اذیت) کے" کی صورت میں بھی کر دیا ہے۔

© rasailojaraid

● ظاہر ہے کہ "پہنچانا' دینا' توڑنا اور کرنا" وغیرہ سام یسوم کا لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اردو محاورے کے مطابق ہی درست ہے۔ اصل مفہوم تو یہی بنتا ہے کہ۔ وہ تمہارے لیے" سوء العذاب" (جس پر ابھی آگے بات ہوگی) کی تلاش میں رہتے تھے۔ مندرجہ بالا آخری ترجمہ کی بنیاد یہی مفہوم ہے۔

۲:۳۲:۱(۴) [سُوْءَ الْعَذَابِ] یہ مرکب (اضافی) دو کلمات یعنی "سوء" اور "العذاب" پر مشتمل ہے۔ پہلے ہر ایک کلمہ کی الگ الگ لغوی وضاحت کی جاتی ہے:

[سُوْءَ] (جو عبارت میں منصوب اور خفیف آیا ہے جس کی وجہ" الاعراب" میں بیان ہوگی) کا مادہ س

© rasailojaraid

وء" اور وزن "فُعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "سَاءَ یَسُوءُ سَوْءًا" (دراصل سَوَءَ یَسْوُءُ) باب نصر سے آتا ہے اور بطور فعل لازم و متعدی (دونوں طرح) مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) (بطور لازم) اس کے معنی ہیں "برا یا قبیح ہونا" مثلاً کہیں گے "سَاءَ الشَّیءُ" (یعنی وہ چیز بری ہو گئی یا اس میں برائی ظاہر ہوئی)۔ اور (۲) "سَاءَہٗ" (متعدی) کے معنی ہیں "اس نے اس کو غمگین کیا۔ وہ اسے برا لگا۔ اس کے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کیا' اس کو بگاڑ دیا"۔ متعدی استعمال میں بعض دفعہ اس فعل پر "بِ" کا صلہ بھی آتا ہے مثلاً "سَاءَ بِهٖ ظَنًّا" (وہ اسے برا لگا بلحاظ گمان کے یعنی اس نے اس کے بارے میں برا گمان رکھا) کبھی "سَاءَ" فعل ذم "بِئْسَ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے "لازم" والے معنوں میں مختلف صیغے ۲۳ جگہ آئے ہیں اور بطور فعل متعدی مختلف صیغے، جگہ آئے ہیں، جن میں سے تین جگہ یہ بصیغۂ مجہول بھی استعمال ہوا ہے اور کم از کم دو جگہ یہ "ب" کے صلہ کے ساتھ بھی آیا ہے۔ اور مزید فیہ کے بابِ افعال کے صیغے کل پانچ دفعہ آئے ہیں۔ افعال کے علاوہ اس مادہ سے ماخوذ اور مشتق مختلف اسماء اور مصادر مختلف صورتوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ وغیرہ) میں ۱۳۰ سے زیادہ مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ ان سب پر حسبِ موقع بات ہو گی۔ ان شاء اللہ۔

● زیر مطالعہ کلمہ "سُوْءٌ" اس فعل (ساء یسوء) سے اسم ہے اور اس کے بنیادی مصدری معنی "برائی" ہیں کبھی بطور صفت بمعنی "برا" بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ دینی، دنیاوی، اخلاقی، مالی معاشی ہر قسم کی برائی کو شامل ہے اس لیے اس کا ترجمہ ضرر، فساد، عیب، بیماری ہلاکت، شرارت، شر نقصان وغیرہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ (سُوْء) قرآن کریم میں مختلف صورتوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ وغیرہ) میں پچاس دفعہ آیا ہے۔ اور ہر جگہ یہ "برائی" کے (مصدری) معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

● اسی مادہ سے ایک اور لفظ "سَوْءٌ" (بفتح السین) بھی "سُوْءٌ" سے ملتے جلتے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں لفظوں (سُوْءٌ اور سَوْءٌ) کے باہمی فرق کو آگے چل کر کلمہ "سَوْءٌ" کے ضمن میں (التوبۃ: ۹۸) بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

کلمہ "اَلْعَذَابِ" کے مادہ' وزن' فعل مجرد وغیرہ پر البقرہ: ۷ [۲: ۶: ۱ (۶)] میں بات ہو چکی ہے لفظ عذاب خود اردو میں اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ مستعمل ہے اور بعض دفعہ اس کا ترجمہ "دکھ' سزا اور تکلیف" سے بھی کر لیا جاتا ہے۔

● اس طرح زیر مطالعہ مرکب اضافی "سوء العذاب" کا ترجمہ تو بنتا ہے "عذاب کی برائی" یا "عذاب کی برائی" صفت بمعنی کے بیان کے لیے ہے ورنہ "عذاب" تو بذاتِ خود "برا" ہی ہوتا

© rasailojaraid
© rasailojaraid

ہے۔ اس طرح "سوء العذاب" کا مطلب "بہت برا عذاب" ہے جسے اُردو مترجمین نے "برے عذاب، برا عذاب، بری تکلیف یا تکلیفیں" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے اور بعض نے شدت والے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے "بڑا عذاب، بری مار، بڑی تکلیف اور بڑا دکھ" سے اور بعض نے "سخت آزاری" سے بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ اصل عبارت میں "بڑا" کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے یہ مفہوم صرف "سوء" اور "عذاب" کی اضافت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ ترکیب (سوء العذاب) آٹھ جگہ استعمال ہوئی ہے۔

۲: ۳۲: ۱(۵) [يُذَبِّحُونَ] کا مادہ "ذ ب ح" اور وزن "يُفَعِّلُونَ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد ذبَحَ ... يَذْبَحُ ذَبْحًا (باب فتح) کے بنیادی معنی تو ہیں "... کا گلا کاٹ دینا" اور چونکہ لفظ "ذبح" اردو میں مستعمل ہے اس لیے اس کا ترجمہ "... کو ذبح کرنا" بھی کیا جا سکتا ہے۔ "علیٰ" کے [illegible] "... پر قربانی دینا یعنی نیاز چڑھانا" ہے (جو غیر اللہ کے لیے قطعاً حرام ہے) اور ان ہی معنی کے لیے قرآن میں آیا ہے: "وما ذبح على النصب (المائدہ: ۳) یعنی (اور اس کا کھانا بھی حرام ہے) جو استھانوں پر نیاز چڑھایا گیا" ڈکشنری میں آپ کو اس فعل کے کچھ اور معانی بھی ملیں گے مگر وہ قرآن کریم میں مستعمل نہیں ہوتے۔

● قرآن مجید میں اس فعل مجرد سے پانچ مختلف صیغے پانچ ہی جگہ آئے ہیں ان میں سے صرف ایک جگہ ہی یہ "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ مجرد کے علاوہ مزید فیہ کے باب تفعیل سے مختلف صیغے کل ۳ جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "یذبحون" اس مادہ سے باب تفعیل کا فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل ذبَّحَ ... يُذَبِّحُ تَذْبِيحًا کے معنی ہیں "کے گلے بکثرت یا بشدت کاٹنا" یکے بعد دیگرے، کثرت سے اور پوری طرح کاٹتے چلے جانا۔ اردو مترجمین میں سے اکثر نے اس کا ترجمہ "ذبح کرتے تھے" ہی کیا ہے (یہاں بھی فعل مضارع بمعنیٰ ماضی استمراری اسی ابتدائی "وإذ" کی وجہ سے ہے) بعض نے "گلے کاٹتے تھے" بعض نے "قتل کر ڈالتے تھے" اور بعض نے "حلال کرتے تھے" بھی کیا ہے یہ آخری ترجمہ "ذبح شرعی یعنی حلال کرنا" سے لے لیا گیا ہے جو ظاہر ہے یہاں غیر موزوں ہے۔

۲: ۳۲: ۱(۶) [أَبْنَاءَكُمْ] کی آخری ضمیر مجرور (کُمْ) تو بمعنی "تمہارے" ہے اور "أَبْنَاء" (جو یہاں عبارت میں منصوب آیا ہے) کا مادہ "ب ن ی" (اور بقول بعض "ب ن و") ہے اس کا وزن "أَفْعَال" ہے۔ یہ لفظ "اِبْنٌ" کی جمع مکسر ہے۔ "ابن" کے مادہ، فعل وغیرہ اور اس کی ساخت اور بناوٹ (لغوی) [illegible] مفصل بحث گزر چکی ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ابن کی جمع سالم (بنون)

© rasailojaraid.com

بھی مختلف صورتوں میں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ وغیرہ) ستر سے زیادہ مقامات پر آئی ہے اور "ابناء" (جمع مکسر) کی مختلف صورتیں ۲۸ جگہ آئی ہیں۔ اس طرح "اَبنَاءَکُم" کا یہاں ترجمہ: "تمہارے بیٹوں کو" یا "تمہارے بیٹے" (اردو فعل کی مناسبت سے "کو" کے بغیر) بنتا ہے۔ جسے بعض مترجمین نے "تمہارے لڑکوں کو" اور بعض نے "تمہاری اولاد ذکور کو" سے ترجمہ کیا ہے جو اصل سے بھی زیادہ بھاری بھرکم ترجمہ ہے۔

۲ : ۳۲ : ۱ (۷) [وَیَستَحیُونَ] میں ابتدائی "وَ" تو عاطفہ (بمعنی "اور") ہے اور فعل "یَستَحیُونَ" کا مادہ "ح ی ی" (اور بقول بعض "ح ی و") اور وزن "یَستَفعِلُونَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب معنی وغیرہ پر البقرہ: ۲۶ [۲ : ۱۹ : ۱ (۱)] میں بات ہوئی تھی۔

● زیرِ مطالعہ لفظ (یَستَحیُون) اس مادہ سے باب استفعال کا فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس کی اصلی شکل یستَحیِیُوْنَ یا یَستَحیِیُونَ تھی۔ پھر واو الجمع سے پہلے والی "و" یا "ی" (یعنی ناقص کا لام کلمہ) [illegible] سے پہلے (عین کلمہ) کی حرکت کسرہ کو ضمہ (ـُـ) میں بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے۔ اس باب سے فعل "اِستَحیَی یَستَحیِی استحیاء" قرآن کریم میں دو معنی میں استعمال ہوا ہے (۱) کسی بات یا شخص سے شرم کرنا، جھینپنا یا عار محسوس کرنا اور (۲) زندہ رہنے دینا، باقی چھوڑنا۔ قرآن کریم میں اس باب سے فعل کے مختلف صیغے نو جگہ آئے ہیں۔ اور معنی کا تعین سیاقِ عبارت سے ہو سکتا ہے۔ اس فعل کی بھی مزید وضاحت [۲ : ۱۹ : ۱ (۱)] میں کی جا چکی ہے۔

● زیرِ مطالعہ عبارت میں "یستحیون" "زندہ رہنے دینا" والے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے مختلف مترجمین نے اس کا ترجمہ "جیتا رکھتے تھے، جیتی رکھتے تھے، زندہ چھوڑتے یا چھوڑ دیتے تھے، زندہ رہنے دیتے تھے، زندہ رکھتے تھے، جیتا چھوڑ دیتے تھے" تمام تراجم درست اور یکساں مفہوم والے ہیں۔ خیال رہے یہاں بھی فعل مضارع کا ترجمہ بصیغہ ماضی استمراری کرنے کی وجہ بھی (شروع آیت والا) "وَاِذْ" ہے۔

۲ : ۳۲ : ۱ (۸) [نِسَآءَکُم] جو نِسَاء + کُم (تمہاری) کا مرکب ہے۔ لفظ "نِسَاءٌ" (جو آیت میں منصوب ہے وجہ نصب کے لیے "الاعراب" دیکھئے) کا مادہ "ن س و" اور وزن "فِعَالٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "نَسَا یَنسُو نَسوَۃً" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "... پر عمل چھوڑ دینا، ... کو بلحاظ عمل ترک کر دینا" عربی میں اس (واوی) مادہ سے صرف فعل مجرد اور مزید فیہ کا باب افعال استعمال ہوتا ہے (اور وہ بھی شاذ)۔ قرآن کریم میں اس سے کوئی صیغہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔

● لفظ "نِسَاءٌ" (جو دراصل "نِسَاوٌ" تھا) اِمرَاَۃٌ (عورت) کی جمع مکسر ہے جو اصل مادہ (م ر ء) سے [illegible] اور جمع مکسر "نِسوَۃٌ" بھی ہے۔ اور یہ دونوں جمعیں قرآن کریم میں متعدد

© rasailojaraid.com

بار (نساء ۵۷ دفعہ اور نسوۃ کل دو دفعہ) استعمال ہوئی ہیں۔ ڈکشنریوں میں آپ کو اس کی کچھ اور جمع مکسر بھی ملے گی۔ مگر وہ قرآن مجید میں کہیں نہیں آئی۔

● اردو میں "نساءکم" کا ترجمہ (یہاں) "تمہاری عورتوں" کو ہی ہو سکتا ہے (اور اکثر نے یہی ترجمہ کیا ہے تاہم بعض حضرات نے اس چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اس سے پہلے "ابناءکم" (تمہارے بیٹے) آیا ہے (رجالکم۔ "تمہارے مرد" نہیں آیا)، تو اس لیے یہاں یہ بیٹوں کے مقابل کا لفظ ہے لہٰذا انہوں نے اس کا ترجمہ "تمہاری بیٹیوں" سے ترجمہ کیا ہے۔ خیال رہے کہ عربی میں لفظ "نساء" "عورتوں، بیویوں اور بیٹیوں" سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن کریم میں یہ لفظ ان تینوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ صحیح معنی مراد کا تعین عموماً سیاق عبارت سے ہو جاتا ہے۔

[وَفِي ذٰلِكُمْ] "ذلکم" دراصل "ذلك" ہی ہے۔ بعید کے اسماء اشارہ (دیکھئے [۲:۱:۱(۱)]) کے ساتھ کاف خطاب استعمال ہوتا ہے یعنی "ذلك، ذلکما، ذلکم، ذلكِ، ذٰلِكُنَّ" یہ سب "ذلك" ہی کے معنی میں ہیں اسی طرح "تلكَ، تلکما، تلکم ... وغیرہ بھی استعمال ہوتے ہیں اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی سے مخاطب ہو کر بات کر رہے ہیں۔ (اور اسی لیے اسے کافِ خطاب کہتے ہیں یہ ضمیر مخاطب نہیں ہوتی)۔ اس طرح یہاں وَ (اور) + فِي (میں) + ذلکم (وہ، اس) کا لفظی اردو ترجمہ "اور اُس میں" ہی بنتا ہے۔ جسے بعض نے "اور اس واقعہ میں" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے جسے تفسیری ترجمہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ بعض نے اس کا ترجمہ صرف "اور یہ" (سخت امتحان تھا) کر دیا ہے جو الفاظِ عبارت اور ترکیب نحوی دونوں کے لحاظ سے محل نظر ہے۔

۲:۳۲:۱(۹) [بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ] جس کی سادہ نثر (Paraphrasing) "بلاءٌ عظیمٌ من ربکم" بنتی ہے اس میں نیا وضاحت طلب لفظ "بلاءٌ" ہی ہے۔ اس لیے کہ مِنْ (کی طرف سے) کے استعمال کی وضاحت ۲:۲:۱(۵) میں اور "رَبِّكُمْ" (تمہارا رب) کے کلمہ "ربّ" کے معانی وغیرہ ۱:۲:۱(۳) میں گزر چکے ہیں۔ اسی طرح لفظ "عظیم" (بہت بڑا) کی مفصل لغوی بحث البقرہ: ۷ [۲:۶:۱(۷)] میں ہو چکی ہے۔

● لفظ "بلاءٌ" کا مادہ "ب ل و" اور وزن "فَعَالٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "بلا... یبلو بلاءً" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "(کسی کا) امتحان لینا، آزمائش کرنا یا آزمائش میں ڈالنا" ہیں۔ یہ فعل بطور متعدی اور مفعول بنفسہٖ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "بَلَوْنَاهُمْ" "ہم نے ان کو آزمایا" (الاعراف: ۱۶۸ والقلم: ۱۷) میں آیا ہے۔ اسی سے یہ فعل بعض دفعہ "ٹھونک بجا کر دیکھ لینا" یا کسی شے کی اصل حقیقت [illegible] کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً (یونس: ۳۰) اسی مادہ سے "باب سمع" کا فعل

© rasailojaraid.

بَلِیَ یَبْلیٰ بِلیً "بوسیدہ ہونا یا مٹ جانا" کے معنی میں بھی آتا ہے تاہم یہ دوسرا فعل "یائی اللام" (ب ل ی) سے ہے۔ اگرچہ واوی بھی باب سمع میں تو یائی ہی ہو کر استعمال ہوتا ہے جیسے رَضِوَ سے رَضِیَ ہو جاتا ہے

● عام ڈکشنریوں (مثلاً المنجد) میں یہ دونوں مادے (بلو اور بلی) فعل مجرد کی حد تک الگ الگ بیان ہوتے ہیں۔ تاہم مزید فیہ (افعال، افتعال وغیرہ) سے آنے والے افعال یائی اللام مادہ (ب ل ی) کے تحت ہی لکھے جاتے ہیں۔ صاحب القاموس (الفیروزآبادی) جنہوں نے تمام ناقص مادوں کے لیے ایک ہی "باب الواو والیاء" اختیار کیا ہے اور ہر جگہ واوی اللام یا یائی اللام کی تمیز کی ہے۔ عجیب بات ہے کہ انہوں نے صرف یائی (بلی) مادہ کو ہی لیا ہے اور "بلا یبلو" کو بھی اسی مادہ سے بیان کیا ہے اور المفردات (راغب) میں بھی اس کی واوی یائی سب صورتوں کو اسی (بلی) کے عنوان کے تحت ہی بیان کیا گیا ہے اسے تسامح ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ بابِ سمع [illegible] تو [illegible] یہ بات قابلِ فہم ہے مگر صرف قرآن کریم میں ہی فعل مجرد "بلا یبلو" سے مختلف ایسے صیغہ ہائے فعل بیس جگہ آئے ہیں جن میں "و" اپنی اصل شکل میں برقرار ہے۔

● قرآن کریم میں فعل مجرد (بلا یبلو) کے علاوہ بابِ سمع سے بھی ایک صیغہ فعل آیا ہے اور اس کے علاوہ بابِ افعال سے ایک صیغہ، بابِ افتعال سے آٹھ صیغے فعل کے اور دو صیغے اسم مشتق کے آئے ہیں۔ مؤخر الذکر افعال (باب سمع، افعال اور افتعال) کو یائی اللام ہی سمجھا جا سکتا ہے مگر نصر ینصر سے استعمال ہونے والا فعل (بلا یبلو) یقیناً واوی اللام ہی ہے۔

● لفظ "بلاءٌ" اس فعل مجرد (بلا یبلو) سے مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ بلکہ یہ بلِیَ یبلیٰ کا بھی مصدر ہے اس طرح اس کے معنی "آزمانا یا آزمائش" بھی ہے اور "بوسیدگی" بھی ہو سکتا ہے (اگرچہ اس معنی کے لیے خاص الگ مصدر "بِلیً" زیادہ استعمال ہوتا ہے)۔ ان بنیادی معنی سے ہی لفظ "بلاء" غم، حزن، رنج، محنت، مشقت کے معنی بھی دیتا ہے اور اپنے بنیادی معنی "آزمائش" اور "امتحان" کی بنا پر یہ بعض دفعہ "انعام" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ آزمائش اور امتحان "مصیبت" کی شکل میں بھی ہوتا ہے اور "نعمت" کی شکل میں بھی جس سے بندے کے "صبر" یا "شکر" کا امتحان مقصود ہوتا ہے بلکہ "مِنحۃ" (نعمت) کو اسی لیے "اعظم البلائین" (دو میں سے بڑی آزمائش) کہا گیا ہے۔ اس طرح اپنے "بلاء" اپنے مقصد یا انجام کے لحاظ سے "بلاءٌ حسن" (اچھی آزمائش) بھی ہوتی ہے اور "بلاءٌ سیّئ" (بری آزمائش) بھی۔

● آیت [illegible] چونکہ بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا ذکر ہے اس لیے اکثر مترجمین نے

© rasailojaraid

یہاں "بلاء من ربکم عظیم" کا ترجمہ "تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بڑی آزمائش / بھاری امتحان / بڑی بلا / سخت آزمائش" بھی سے ہی کیا ہے۔ لیکن شروع آیت "واذ نجّیناکم من اٰل فرعون" (ہم تم کو آل فرعون سے نجات دلائی) میں ابتداً ذکر اُن مصائب سے نجات کا ہے اس لیے بعض مترجمین نے "وفی ذلکم" میں اشارہ اسی "نجّیناکم" کی طرف سمجھتے ہوئے یہاں "بلاء عظیم" کا ترجمہ "بڑا انعام" ہی کیا ہے "یعنی تم کو آل فرعون کے مظالم سے نجات ملنا ایک عظیم نعمت تھی اور غالباً اسی لیے شاہ عبدالقادرؒ نے یہاں اصل الفاظ سے ہٹ کر "وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم" کا تفسیری ترجمہ اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی" کی صورت میں کیا ہے۔ جس میں وہی "انعام" والا مفہوم موجود ہے۔ خیال رہے کہ لفظ "بلاء" قرآن کریم میں کچھ جگہ آیا ہے اور ان میں سے کئی جگہ اسے بمعنیٰ "انعام" کیا جا سکتا ہے[1]۔ اس لیے کہ اللہ کا انعام [illegible]

۲ : ۳۲ : ۱ (۱۰) [وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ] "وَاِذْ" (اور جب) کی لغوی نحوی وضاحت ابھی اوپر اسی قطعہ کے شروع میں [۲ : ۳۲ : ۱] میں ہو چکی ہے اور آخری "بِکُم" کا ترجمہ بار کو سببیہ سمجھتے ہوئے "تمہارے سبب سے" "تمہاری وجہ سے" ہو سکتا ہے یا "بِ" کو "لِ" کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے یعنی "لکم" (تمہارے لیے)۔ اکثر مترجمین نے دو ترجمے کیے ہیں۔

اور [فَرَقْنَا] کا مادہ "ف ر ق" اور وزن "فَعَلْنَا" ہے ۔ اس مادہ سے فعل مجرد مختلف ابواب سے مختلف مصادر کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے مثلاً (۱) فَرَق ..... یفرُق فَرْقاً و فُرقاناً (نصر سے) کے معنی ہیں "... کو تقسیم کر دینا، ... کے کئی حصے کر دینا، جدا جدا کر دینا مثلاً کہتے ہیں "فَرَقَ الشیئَ" (اس نے چیز کے کئی حصے کر دیئے) اور "فَرَقَ بینَ الشیئینِ" کا مطلب ہے "اس نے دو چیزوں کو باہم (ایک دوسری سے) ممتاز اور جدا کر دیا" اور "فرق بینَ الخصمین" کا مطلب ہے "اس نے دو فریقِ مقدمہ کے درمیان فیصلہ کر دیا" اور "فرق اللّٰہُ الکتاب" کے معنی ہیں "اللہ نے کتاب کو واضح کر دیا" اور اسی سے ہے "وقرآناً فرقْنٰہ" (الاسراء : ۱۰۶) (۲) اور "فَرِق یفرَق فَرَقاً" (باب سمع سے) کے معنی ہیں "خائف ہونا، بہت گھبرا جانا، ڈر جانا اور اسی سے ہے "لکنّھم قومٌ یفرَقون" (التوبہ : ۵۶) (یعنی وہ "ڈرپوک" جانے والے لوگ ہیں)۔ یہ فعل لازم ہے اور "جس سے ڈر گیا" کا ذکر کرنا ہو تو "مِنْ" استعمال ہوتا ہے کہیں گے "فرِق مِنہُ" (وہ اس سے گھبرا گیا)

● اس فعل مجرد کے مندرجہ بالا معانی تو قرآن کریم میں آئے ہیں۔ آپ کو ڈکشنری میں اس کے

---

[1] مثلاً الدخان : ۳۳ اس کی واضح مثال ہے۔

© rasailojaraid.com

کئی ایسے معانی بھی مل سکتے ہیں جو غیر قرآنی ہیں۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے پانچ جگہ آئے ہیں۔ باب تفعیل سے مختلف صیغے ۹ جگہ، تفعّل سے ۸ جگہ اور باب مفاعلہ سے صرف ایک ہی صیغہ آیا ہے اس کے علاوہ مختلف مصادر اور اسمائے مشتقہ وغیرہ ۳۹ جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ فعل "فَرَقْنَا" اس فعل مجرد سے ماضی معروف کا صیغہ جمع متکلم ہے۔ مندرجہ بالا معانی میں سے پہلے معنی (تقسیم کرنا، جدا جدا کرنا) کو ملحوظ رکھتے ہوئے مترجمین نے یہاں اس (فرقنا) کا ترجمہ "ہم نے پھاڑا/ چیرا/ شق کر دیا/ پھاڑ دیا کی صورت میں ہی کیا ہے۔ یہاں یہ ترجمہ اگلے لفظ البحر (سمندر) کی مناسبت سے کیا گیا ہے جس کے لیے دوسری جگہ قرآن کریم میں لفظ (اسی قصہ کے ضمن میں) "فانفلق" (پس پھٹ گیا) آیا ہے۔ صاحب المفردات نے "فَلَق" اور "فرَق" میں یہ تمیز کی ہے کہ لفظ "فلق" میں "انشقاق" (پھٹ جانا) کا لحاظ ہے اور "فرق" میں انفصال (جدا ہونا) کا۔ اگرچہ دونوں ہم معنی ہیں۔

۲ : ۳۲ : ۱ (۱۱) [البَحْرَ] کا مادہ "ب ح ر" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعْلٌ" ہے۔ آیت میں لفظ منصوب آیا ہے اس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل مجرد باب فتح اور باب سمع سے مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً "بَحَرَ الارض بَحْرًا" (فتح سے) کے معنی ہیں: اس نے زمین کو پھاڑا۔ اور "بَحَرَ الناقَةَ" (فتح سے) کے معنی ہیں "اس نے اونٹنی کا کان چیر دیا۔" (ایسی اونٹنی کو ہی "بَحِیرَة" کہتے تھے اس کا ذکر آگے (المائدۃ : ۱۰۴) آئے گا اور "بَحِرَ یَبحَرُ بَحَرًا" (سمع سے) کے معنی ہیں "سمندر کو دیکھ کر ڈر جانا یا گھبراہٹ اور پریشانی کے باعث حیران رہ جانا" ــــ تاہم قرآن کریم میں اس سے کسی قسم کے فعل (مجرد یا مزید فیہ) کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ فعل مجرد تو عام عربی میں بھی شاذ ہی استعمال ہوتا ہے۔

● زیر مطالعہ لفظ (بَحْر) اس فعل مجرد سے مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ بطور اسم اس کا عام اردو ترجمہ "سمندر" ہے۔ تاہم بیشتر مترجمین نے اس کا ترجمہ "دریا" ہی کیا ہے۔ اور عربی زبان میں بحر سے "بہت بڑا دریا" مراد لینے کی گنجائش ہے عربی زبان میں استعارۃً اور مجازاً "بحر" تیز رفتار اور "وسیع" کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً "البحر من الخیل" (تیز رفتار گھوڑا) اور "البحر من الرجال" وسیع العلم آدمی کو کہتے ہیں) تاہم قرآن کریم میں یہ استعمال کہیں نہیں آیا۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "دریائے شور" کیا ہے (یعنی کھاری دریا) اور یہ سمندر کے لیے فارسی لفظ ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کے قانون فوجداری (Penal Code) کے اردو ترجمہ (تعزیرات ہند) میں (جو غالباً ڈپٹی نذیر احمد نے کیا تھا) "عمر قید مع سمندر پار جلاوطنی" (سزا) [illegible] کیا گیا تھا جسے عام طور پر "کالا پانی" کہا جاتا تھا۔ انگریز کے زمانے

میں ایسے قیدی عموماً خلیج بنگال کے جزائر انڈیمان اور نکوبار میں بھیجے جاتے تھے۔ غالباً اسی قانونی اصطلاح سے مترجم نے "دریائے شور" کے ساتھ ترجمہ کرنا مناسب سمجھا۔

● لفظ "البحر" (مفرد معرفہ) قرآن کریم میں ۳۲ جگہ آیا ہے۔ اس کا صیغہ تثنیہ ۵ جگہ اور جمع مکسر (بحار اور ابحر) بھی تین جگہ آئی ہے۔

۲:۳۲:۱ (۱۲) [فَاَنْجَیْنٰکُمْ] یہ "فَ" (پس پھر) + اَنْجَیْنَا (جس پر ابھی بات ہوگی) + کُمْ (تم کو) کا مرکب ہے۔

"اَنْجَیْنَا" کا مادہ "ن ج و" اور وزن "اَفْعَلْنَا" ہے۔ یعنی یہ اس مادہ سے باب افعال کا صیغہ ماضی ہے بظاہر اسے "اَنْجَوْنَا" ہونا چاہیے تھا مگر ناقص افعال کے مزید فیہ میں "و" کو "ی" بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے۔ (یہی بات ابھی اوپر "نَجَّیْنَا" میں بھی ہوئی تھی)

● اس مادہ سے فعل مجرد (نجا ینجو) کے باب اور معنی وغیرہ پر ابھی اوپر [۲:۳۲:۱(۱۱)] میں بات ہو چکی ہے۔

زیر مطالعہ لفظ (اَنْجَیْنَا) اسی مادہ سے باب افعال کا فعل ماضی صیغہ جمع متکلم (مع ضمیر تعظیم "نحن") ہے۔ اس باب سے فعل "اَنْجٰی.... یُنْجِیْ اِنْجَاءً" (دراصل اَنْجَوَ یُنْجِوُ اِنْجَاوًا) کے معنی ("نَجّیْنَا" کی طرح) "..... کو نجات دلانا، بچالینا" وغیرہ ہیں (دیکھئے اوپر ۲:۳۲:۱(۱) میں)۔ عربی زبان میں یہ فعل بعض دیگر معانی (مثلاً اونچی جگہ پر آنا وغیرہ) بھی دیتا ہے مگر قرآن کریم میں یہ استعمال نہیں آیا — قرآن کریم میں اس باب (افعال) والے فعل کے مختلف صیغے ۲۲ جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ یہ فعل مندرجہ بالا (نجات دلانا) والے معنی کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ "ہم نے تم کو نجات دلائی / چھٹکارا دیا / بچالیا / بچا دیا / " سے کیا ہے۔ اکثر نے "نجات دلائی" ہی اختیار کیا ہے۔ لفظ "نجات" کی اصل عربی شکل وغیرہ بھی ۲:۳۲:۱(۱) میں بیان ہو چکی ہے۔ بہر حال یہ لفظ اردو میں رائج ہے۔

۲:۳۲:۱ (۱۳) [وَاَغْرَقْنَا] میں "وَ" تو عاطفہ (بمعنی "اور") ہے۔ اور [اَغْرَقْنَا] کا مادہ "غ ر ق" اور وزن "اَفْعَلْنَا" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "غَرِقَ یَغْرَقُ غَرَقًا" (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو "ڈوب جانا / ڈوب کر مرنا یا مرنے کے قریب ہونا" ہیں مثلاً کہتے ہیں "غرق فی الماء" (وہ پانی میں ڈوب مرا) یا "غرقتِ السفینۃ" (کشتی ڈوب گئی)۔ اس کے علاوہ یہ فعل اس باب (سمع) سے اور "نصر" سے بھی بعض دیگر معانی (مثلاً برباد کرنا، گڑبڑ کر دینا وغیرہ) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد کا کوئی صیغہ (کسی معنی کے لیے بھی) وار

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

نہیں ہوا۔ البتہ فعل مجرد کا مصدر ایک جگہ (یونس : ۹۰) آیا ہے۔

● زیرِ مطالعہ لفظ (اَغرقنا) بابِ افعال کا فعل ماضی صیغۂ تعظیم (جمع متکلم) ہے اس باب سے فعل "اَغرق ..... یُغرِق اِغراقاً" کے معنی ہیں "... کو ڈبو دینا، ..... کو ڈبو کر ہلاک کرنا؛ ... کو غرق کرنا" (یعنی اس کے فعل مجرد کا یہ مصدر "غرق" تھوڑے سے بدلے ہوئے تلفظ کے ساتھ اردو میں مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں اس (باب افعال) سے فعل کے مختلف صیغے ۱۱ جگہ آئے ہیں اور بعض دیگر مصادر اور اسماء مشتقہ بھی ۶ جگہ آئے ہیں۔ اکثر مترجمین نے "اور ہم نے غرق کر دیا" سے اختیار کیا ہے اگرچہ بعض نے "ڈبایا" "ڈبا دیا اور ڈبو دیا" کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے۔

[آلَ فرعَونَ] اس مرکب کے دونوں اجزاء پر الگ الگ اور پھر مرکب کے ترجمہ پر ابھی اوپر [۲:۳۲:۱(۲)] میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔

۲:۳۲:۱(۱۴) [وَاَنتُمْ تَنظُرُونَ] میں "وَ" بمعنی "حالانکہ" اور "جب کہ" ہے۔ "اَنتُمْ" ضمیر مخاطب بمعنی "تم" ہے۔ "تَنظُرُونَ" کا مادہ "ن ظ ر" اور وزن "تَفعُلُونَ" ہے یعنی یہ فعل مجرد کا صیغہ مضارع جمع مذکر حاضر ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "نظَر ... ینظُر نظراً" (نصر سے) بطور فعل متعدی کئی معنی دیتا ہے مثلاً "... کو دیکھا، ... اسے نظر آ گیا" (اردو میں لفظ "نظر" مستعمل ہے)۔ کہیں گے : "نظَرَہٗ" (اس نے اس کو دیکھا) اسی طرح "... کی حفاظت کرنا، ... پر توجہ دینا" اور "... کا انتظار کرنا" بھی اس ہی کے معنی ہیں۔

● عموماً تو یہ فعل مفعول بنفسہ کے ساتھ ہی آتا ہے تاہم یہ "الی" اور "فی" کے صلہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "نظر الی الشیئ" (اس نے چیز کو غور سے دیکھا۔ اس پر نظر ڈالی) اور "نظر فی الامر" (اس نے معاملے پر سوچ بچار کیا، غور و فکر کیا)

قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے ۸۰ جگہ آئے ہیں اور مذکورہ بالا تینوں استعمال (بنفسہ یا الی اور فی کے ساتھ) وارد ہوئے ہیں البتہ بعض دفعہ اس کا مفعول محذوف (غیر مذکور) آیا ہے۔

● اس طرح اس جملے "وانتم تنظرون" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "اور / درانحالیکہ / جب کہ / تم دیکھتے تھے" (یہاں بھی فعل مضارع "تنظرون" کا ترجمہ ماضی استمراری کی طرح کرنے کی وجہ وہی ابتدائی "وَاِذْ" ہے جو زمانہ ماضی کے لیے ظرف ہے)۔ اسی کو بعض حضرات نے "تم دیکھ رہے تھے" "تم معائنہ کر رہے تھے" "دیکھ ہی تو رہے تھے" سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے جملے میں "حال" والے مفہوم کی بنا پر ترجمہ "تمہارے دیکھتے (دیکھتے)" بھی کیا ہے۔ بعض نے اردو محاورے میں حال کا مفہوم برقرار رکھنے کے لیے اس جملے (وانتم تنظرون) کا "تمہاری آنکھوں کے سامنے" سے ترجمہ کیا ہے جو اردو محاورے کے لحاظ سے بہت اچھا ترجمہ ہے اگرچہ الفاظ کی حد تک اصل عبارت سے ہٹ کر ہے۔ اصل عربی عبارت "امامَ اَعینکم" یا "تحتَ اَعینکم" تو نہیں ہے۔

(جاری ہے)

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c